عصری اور دینی تعلیم ـــــ ایک تقابلی جائزہ

صابر حسین صابری

۷ مئی ۲۰۰۵ء کو روزنامہ جنگ کا اداریہ ''دینی مدارس میں جدید عصری علوم'' کے عنوان سے تھا جس میں دینی مدارس اور اس کے نصاب تعلیم کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ شعبۂ انجینئرنگ سے تعلق رکھنے والے ایک دردمند مسلمان صابر حسین صابری، میکینکل انجینئر نے ان کی اس بے جا تنقید کا منصفانہ جائزہ لے کر اس پر علمی انداز میں اُس کالم کا جواب لکھا تھا، ذیل میں وہ خط نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ ـــــ ادارہ

جناب محترم ارشاد احمد حقانی اور جناب محترم میر شکیل الرحمٰن صاحب

السلام علیکم

بحوالہ آپ کا اداریہ: ۷ مئی ۲۰۰۵ء بعنوان ''دینی مدارس میں جدید عصری علوم''

پچھلے کئی سالوں سے ایسا ہورہا ہے کہ ہر حاکم، ہر انگلش خواندہ اور سائنسی تعلیم یافتہ ایک ہی بات پر زور دیئے چلا جارہا ہے کہ دینی مدارس میں جدید تعلیم، دینی مدارس میں عصری علوم شروع کیے جائیں۔ میری رائے میں یہ یکطرفہ اور یکرُخہ فیصلہ ہے اور یہ کسی دلیل اور برھان اور کسی عقلی تجزیہ سے بالکل خالی محض ایک تقلیدِ رسمی، اطاعتِ ماحول اور اسلامی تعلیم سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ میں یوں کہوں گا کہ ''انگریزی یا دنیاوی مدارس میں دینی علوم کی اشد ضرورت ہے''۔ ہم کیوں یہ بات سمجھنے سے عاری ہیں اور ہمارے علوم کو شاید زنگ لگ گیا ہے کہ ہم صرف لے دے کر ساری کتر بیونت، سارا تختۂ مشق، ساری کمی بیشی دینی تعلیم ہی میں سمجھتے ہیں۔ جو کالج اور یونی ورسٹی سے چند حروف کی سند لے کر نکلتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے اور سارے دنیا کے انسانوں کو یہ سمجھانے پر اپنا زور لگانا شروع کردیتا ہے کہ دینی مدارس میں وہ کچھ پڑھایا جائے جو ہم کالجوں یونی ورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ شاید ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ترقی میں مولوی اور مدرسے کی تعلیم حائل ہے۔

یہ بات بالکل سب پر واضح ہے کہ آج کا زمانہ فنون میں مہارت یعنی اسپشلائزیشن کا ہے۔ دینی یا دنیاوی میدانوں کی تعلیم میں کسی فردِ واحد کے اختیار سے یہ بالا ہے کہ وہ بیک وقت انجینئر بھی ہو، ڈاکٹر بھی ہو، ماہرِ معاشیات بھی ہو اور عالمِ دین بھی ہو، حافظ بھی ہو، قاری بھی ہو وغیرہ وغیرہ۔

اس دور میں کسی شخص کے لیے کسی بھی علم کی کسی ایک شاخ کے تمام عوارض واطوال کو جاننے کے لیے اس کی ساری عمر بھی ناکافی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا پوری طرح ادراک ہونے سے ہر مسلمان کے لیے یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ وہ دینی مدارس سے کیا چاہتا ہے۔

ہر علم کی ایک مخصوص معاشرتی اور (دینی یا دنیاوی) ضرورت اور اس کے لیے مخصوص طریقۂ حصول ہے۔ کوئی بھی علم بے کار اور بے مقصد نہ پڑھایا جاتا ہے نہ ہی سیکھا جاتا ہے جب تک کہ وہ کسی مخصوص حاجتِ انسانی کے لیے کارآمد نہ ہو۔ تمام مروجہ یونی ورسٹیوں میں جو علوم آج سننے میں آرہے ہیں وہ پہلے روز سے ہی متعارف نہیں ہوگئے تھے بلکہ جوں جوں انسانی معاشرہ ترقی اور عروج کی طرف استدراجی کیفیت سے بڑھتا رہا ہے توں توں یہ علوم اپنی افادیت، ضرورت، حیثیت سے سامنے آتے چلے گئے۔

جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو اس کے فوراً بعد اس کو یہ خیال آیا کہ اس کو مار تو دیا مگر اب اس کو کہیں غائب یا اپنی نگاہ سے دور کیسے کروں؟ ایک فعل تو ہو گیا تھا مگر اگلے فعل کا اس کو علم نہیں تھا۔ اب یہاں علمِ تدفین کی ضرورت تھی جو ایک پرندے کی شکل میں اس کو سکھایا گیا۔ علم دیا گیا مگر پہلے اس کی ضرورت پیدا ہوئی بعد میں اس کا سبب بھی پیدا کر دیا گیا۔

قابیل کو جو ضرورت درپیش تھی اور اس وقت جس علم کی ضرورت تھی اتنا علم اس کو فطرت نے اپنے طریقہ تدریس سے سکھا دیا۔ ایسے ہی انسانوں کو آج تک کے سارے علوم فطرت سے وقتاً فوقتاً ودیعت کیے گئے۔ اس تمہید کے بعد یہ عرض ہے کہ علوم دو قسم کے ہیں جن کی تقسیم وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی انسانی نفوس نے اختیار کر لی۔

ایک طبقہ اسباب اور ضروریاتِ حیات کے علم میں لگ گیا جس کو دنیاوی علم کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ اپنی دنیاوی ضروریات کو مؤخر کر کے اپنی اخروی ضروریات کے علم کے حصول میں لگ گیا، اس کو دینی علم کہا گیا۔ دونوں علوم کی جداگانہ اہمیت اور ضرورت کی طرف میں نہیں جاؤں گا۔ عرفِ عام میں دینی تعلیم سے مراد یہ سمجھی جاتی ہے کہ جن علوم کا تعلق قرآن، حدیث، فقہ، اجتہاد، مسائل، یجوز لا یجوز وغیرہ سے ہو۔ ان علوم کو جو سیکھتا اور سکھاتا ہے اس کو مولانا، مطوع، ملا، عالم، مفتی حافظ وغیرہ کے القاب سے پکارا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں اپنی سارے انحطاط کے باوجود یہ قابلِ عزت واحترام القاب ہیں۔ اس علم کے سیکھنے کے لیے ذاتی جدوجہد اور انفرادی لیول کی محنت درکار ہے، حکومتی سطح پر کوئی منظم، مبسوط درس گاہ کا وجود نہیں ہے۔

دوسرا دنیاوی علوم ہیں۔ ان کے سیکھنے کی جگہ اسکول، کالج، یونی ورسٹی اور بڑے بڑے منظم اور عظیم ادارے موجود ہیں۔ یہ ادارے حکومت اور عوام کی بے پناہ محنت، توجہ، سرمایہ اور کوشش سے دن رات بنائے جا رہے ہیں اور چاروں طرف پھیلائے جا رہے ہیں تاکہ معاشی، عصری، سائنسی علوم کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔ جو ان سے پڑھ کر اور سیکھ کر نکلتے ہیں ان کے لیے باعزت روزی معاشرتی درجے میں باعزت القاب اور باعزت آداب وضوابط کا ایک نظام قائم ہے جو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ جو بھی اس تعلیم کی سند لے کر آئے گا اس کو ان القابات سے نوازا جائے گا۔ وہ حسبِ تعلیم اور حسبِ قابلیت بابو، کلرک، چپڑاسی، ایل ڈی سی، یو ڈی سی، سیکشن افسر، سیکریٹری، انجنیر، ڈاکٹر، اکاؤنٹنٹ، بینکر، سپاہی، رنگروٹ، کیپٹن وغیرہ بنتے ہیں اور وقت کے ساتھ ترقی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ ملکی عہدوں اور بڑی پوزیشنوں کو سنبھالتے ہیں۔ آج کے کسی بھی اسلامی یا غیر اسلامی معاشرے کی یہ تقسیمِ تعلیم ہمارے سامنے ہے اور اس کا مشاہدہ سورج کی طرح روشن ہے اس سے ملک کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔

اب یہاں پہنچ کر مسئلہ متنازعہ شکل اختیار کر جاتا ہے۔ میرا مدعا اور میرا مافی البیان یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

پہلی بات: جب یہ دو دریا الگ الگ رنگوں کے پانی اور جدا جدا موجوں کی طغیانی والے ہیں تو ان کو یکجا کرنے کی کوشش سے کیا حاصل ہوگا۔ ایک عذب فرات (شیرین، خوش ذائقہ) ہے اور دوسرا ملح اجاج (تلخ، کڑوا) ہے تو ان کو ملا کر کون سا حلوہ تیار ہوگا۔

ہم دینی درس گاہوں کی تعلیمی کمی اور نقائص پر زورِ ابلاغ صرف کرنے کے بجائے پہلے اس بات کا تھوڑی دیر کے لیے جائزہ تو لے لیں کہ دینی تعلیم کا مزاج (Trend)، اس کا مقصد (COncept)، اس کی نسبت (Origin) اس کا نصاب اور اس کی اہمیت دنیاوی تعلیم کے مقابلے میں کتنی ہے۔ دینِ اسلام کی پہلی اکائی اور ابتدا غارِ حرا ہے۔ یہ حرائی اور کہفی مزاج اور ذوق والا ہے، یہ علمِ زراعت سے انکار نہیں کرتا مگر علمِ قناعت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس سے ذرا آگے چلیں جب اس کو غلبہ مل جاتا ہے تو بھی یہ پہلے مسجد ہی بنتا ہے اور اس میں اصحابِ صفہ کا مدرسہ قائم کرتا ہے۔ یعنی یہ صفوی مزاج ہے۔ یہ بتوں کے سامنے دھیان گیان کرنے والا دین نہیں بلکہ غیب پر ایمان وایقان والا دین ہے۔ دنیاوی علوم کے مدارس زرخیز اور بارونق آباد جگہوں میں بنائے جاتے ہیں، یہ دین ویرانوں اور غیرِ ذی ذرع میں آ کر اذان دینے والا اور بے آب وگیاہ بنجر زمین پر پہلے عبادت کے لیے گھر بنانے والا اور دوسروں کو اس کی طرف بلانے والا ابراہیمی صفت رکھتا ہے۔ دنیاوی مدارس کی طرح دینی مدارس میں جو بھی پڑھایا جاتا ہے ان علوم کو کسی بھی لیبارٹری میں ثابت اور ٹیسٹ نہیں کیا جاسکتا۔ دینی تعلیم بخلاف دنیاوی تعلیم کے مادے اور مادیت کی بحث سے بالا اشیاء کے وجود اور ان کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ دینی تعلیم زمین کے نیچے اور آسمان سے اوپر کی بات اور اس کے اسرار ورموز کی عقدہ کشائی کی طرف راہنمائی کرنے والی ہے۔ ہم اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ دینی تعلیم موت، قبر، قیامت، اعمال کی جزا اور قال اللہ اور قال الرسول کی تعلیم ہے۔ دینی مدارس میں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ قاتل جارج بش اور قاتلہ الزبیتھ کی باتیں کی جائیں۔ کیا ہم نے فزکس پڑھتے ہوئے یا کیمسٹری کی ایڈوانس کتاب پڑھتے ہوئے کبھی پروفیسر سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ قال عمر یا قال عثمان ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے جو سمت میں مخالف اور قوت میں برابر ہوتا ہے۔ اگر کوئی لیکچر دینے والا یہ بات لیکچر میں کہہ دے تو اس کو نیم پاگل قرار دے کر فارغ کردیں گے۔ اس لیے کہ یہ میدان اور یہ مقام عمر اور عثمان کا ہے ہی نہیں اس فیلڈ کے کھلاڑی نیوٹن اور دوسرے لوگ تھے۔

اس لیے ہم پہلے اس بات کو یقین کے درجے میں سمجھ لیں کہ مدارس کی زمین عیسائیت، یہودیت، مادیت کی تعلیم دینے کے لیے ہرگز ہرگز مناسب نہیں ہے۔ یہ پودے اس مٹی میں کبھی زندہ ہی نہیں رہ سکتے کجا یہ کہ ان کی آبیاری اور پنیری لگانے کی کوشش کی جائے۔ دنیاوی تعلیم کو سیکھنے اور سکھانے کی حرص ہم پر اتنی غالب ہوچکی ہے کہ ہم ان دور افتادہ، کہفی صفت، خانقاہی مقامات تک پہنچ کر وہاں بھی اپنی دنیا کی تزئین وآرائش کے سامان کی فکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ جن دنیاوی علوم نے اپنے سیکھنے والوں کی راتوں کی نیند اور دن کا قرار چھین لیا ہے ان کو قبیح ترین اور مغلظ ترین جرائم کے کینسر میں مبتلا کر دیا ہوا ہے ہم اب اس کینسر کو ان مسکینوں اور عاقبت بینوں تک بھی پہنچانے کی فکر میں شب وروز غلطاں

پہچان ہیں۔ان عصری علوم کی بلندیوں تک جو پہنچ چکے ہیں انھوں نے انسانیت کو کیا دیا، ہیروشیما میں ایک سیکنڈ کے اندر ایک لاکھ انسان ۳۰۰ سینٹی گریڈ ہررات پر بھون دیئے گئے۔ جو اپاہج ہوئے ان کو شمار نہ کریں۔کیا کسی بھی دینی تعلیم کے حامل کی کسی ایجاد سے اتنے انسان ایک لمحے میں اس قدر لقمۂ اجل بنے؟ یہ معجزات کارنامے کس تعلیم کے متعلمین کے ہیں؟ میں مزید اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

دوسری بات: جب دینی مدارس سے طلبا، مفتی، حافظ بن کر نکلتے ہیں تو ان کے لیے مخصوص کوٹہ یا عہدہ کہیں بھی نہیں ہوتا۔اس بے اسبابی کے باوجود آج تک کسی دینی مدرسے کی طرف سے نہ کوئی جلوس نکلا ہے نہ کوئی ہڑتال ہوئی ہے نہ ہی کوئی مطالبہ پیش کیا گیا نہ ہی اسمبلی میں کوئی بل رکھا گیا۔اس لیے کہ وہ طبقہ جو مدارس کی دریوں اور فرشوں پر بیٹھ کر پڑھتا ہے اس کی تعلیم اور تربیت میں یہ بات رچی بسی ہوتی ہے کہ میں نے معاشرے پر کوئی حق نہیں جتانا بلکہ إن اجــــري إلاعلى الله والی شکل پر عمل کرنا ہے۔

اگر میں اس بات کے لکھنے میں غلط دعوی کروں تو میری بات رد کردی جائے اور اگر یہ سچ ہے تو پھر اس طبقے کو اس کا حقیقی مقام دیا جائے۔ اس کے بالمقابل آئے دن کی کالجوں، اسکولوں کی ہڑتالیں، وہاں قتل وخون، اساتذہ کے جھگڑے، طلبا کے فساد، نوکریوں کے لیے دھرنے اور جلاؤ گھراؤ جو ہو رہا ہے اس کا کیا جواز ہے۔وہ طبقہ جو معاشرے کو صبر، شکر کی تلقین کرنے والا ہے، بے بسی پر برداشت، اللہ سے مانگنے والا اور اپنی حاجات کو مختصر کرنے والا اور محدود ذرائع میں گزارا کرنے والا ہے کیا وہ طبقہ قابلِ تحسین نہیں ہے؟ کیا وہ تعلیم احسن اور ارفع نہیں ہے۔وہ درس گاہ جو معاشرے سے چھیننا نہیں بلکہ عطا کرنے کی تعلیم دیتی ہو، جو لوٹنے کی نہیں بلکہ خود کو اللہ کے بندوں کے سامنے لٹا دینے کی تعلیم دیتی ہو، جو حقوق کے مطالبے اور حکمرانوں کے محاسبے، مقابلے، مقاتلے کی نہیں بلکہ احسان، دعوت اور محبت کی تعلیم دیتی ہو کیا ان درس گاہوں کو ابھی بھی کسی اور بیساکھی کی ضرورت ہے۔

مسجد کے امام کی رہائش گاہ اور ایک کسٹم کے محکمے کے کلرک کی رہائش گاہ کا موازنہ کیجیے اور اللہ کو جو جواب دینا ہے وہ سوچ لیجیے۔جو تنخواہ ہم ایک مؤذن کو دیتے ہیں اس کو اگر لکھ دوں تو شرم سے قلم بھی خشک ہو جائے مگر اس کے باوجود ہم اس بات پر بضد ہیں کہ دینی مدارس کی، مولوی کی، مؤذن کی، ملا کی، مفتی کی اصلاح کرو یہ طبقہ بگڑا ہوا ہے۔

دوسری جانب ایک ایف اے پاس کلرک کی زندگی کا موازنہ کیجیے اور جس قدر وہ ظلم اور تعدی کو معاشرے میں پھیلا رہا ہے اس کو دیکھیے اور پھر انصاف کے لیے اپنے قلب سے فتوی لے لیجیے کہ یہ بہترین مفتی ہے۔دوسری جانب دنیاوی تعلیم کی درس گاہوں سے فارغ ہونے والے ان اداروں سے نکلتے ہی اونچے عہدوں پر متمکن کر دیئے جاتے ہیں اور یہ عہدے ان ہی بلند پردازوں کے لیے مختص کر دیے گئے ہیں۔ایسی صورتِ حال میں دینی تعلیم والوں کو دنیا کی تعلیم سے بہرہ مند کر بھی دیا جائے تو ان بوریہ نشینوں کو کون سے سرخاب کے پَر لگا دئے جائیں گے یا لگ سکتے ہیں یا کسی کو لگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ جب دو میدان الگ الگ کھیل کے کھیلنے کے لیے مخصوص ہیں تو پھر دونوں کو کس طرح ملا کر کھیلا یا کھلایا جاسکتا ہے۔ایک فرش پر بیٹھ کر پڑھتا ہے، فرش پر (قالین یا دری بچھا کر اور اکثر ننگے فرش پر) قرآن یاد کرتا ہے

دوسرا کرسی پر بیٹھ کر ۲۴ سال تک پڑھتا ہے، دونوں کے ذہنی اور فکری ڈھانچے میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ ایک کو پہلا درس عاجزی اور تمکنت، ادب اور جھکاؤ کا دیا جاتا ہے اور اس کو مٹنا اور نفس کی شرارت سے خبردار رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسرے کو پہلے دن سے گردن اونچی کر کے رکھنا، اکڑ کر چلنا، رعب سے بات کرنا، اسمارٹ رہنا اور مٹی میں نہ کھیلنے کی سختی سے ہدایت کی جاتی ہے۔ پہلے کو یہ سبق ازبر کرایا جاتا ہے کہ اسی مٹی میں ہم کو جانا ہے اس پر اکڑ کر چلنے کا حق نہیں ہے۔ ایک طرف یہ سکھایا اور سمجھایا جارہا ہے کہ بیٹھ کر کھانا ہے، مل کر کھانا ہے، دسترخوان بچھا کر کھانا ہے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کھڑے ہو کر کھانا ہے، ٹیبل پر کھانا ہے، چمچ چھری سے کھانا ہے ہاتھوں سے نہیں کھانا کہ اس کے ساتھ جراثیم اندر جاتے ہیں، گلے میں نیپکن باندھ کر کھانا ہے۔ اپنی پلیٹ میں سے کھانا ہے دوسرے کی پلیٹ میں جراثیم ہوتے ہیں اس کو ہاتھ نہیں لگانا۔

جو بچہ مدرسہ میں پڑھتا ہے، وہ لامحالہ دن میں تین بار اس مشق سے گزرتا ہے اور تعلیم سے جب وہ ۲۰ سال کا ہو جاتا ہے تو فارغ ہوتا ہے اس وقت اس کی ذہنی اور اخلاقی کیفیت اس کے برابر ہو سکتی ہے جس کو کالج نے اس کے مقابلہ میں بالکل متضاد طرزِ زندگی کا ۲۴ سال اس کے متوازی تعلیم دی ہو۔ دونوں میں کیسے توازن اور ہم آہنگی ہو سکتی ہے۔ ایک کو پہلے روز سے چہرے اور جسم کو مشابہت رسول کے قریب تر لانے کی تعلیم دی جاتی رہے اور دوسرے کو بہترین شیونگ مشین دیکر اس کو کلین شیو رہنے اور صاف ستھرا رہنے کی مشق سے گزارا جاتا رہا ہو ایسے میں کیا دونوں عملی زندگی میں برابر کی دوڑ دوڑ سکتے ہیں۔

میں یہ باتیں افسانوی اور جناتی قصوں کی دنیا میں رہنے والوں سے نہیں کر رہا بلکہ یہ اس دنیا، اس زندہ معاشرے کے روز و شب کی عملی تصویر ہے۔ حقیقتاً ایسے ہی ہو رہا ہے اور دونوں تعلیموں کا جو ٹکراؤ اور تصادم ہم کو نظر آ رہا ہے وہ اس ساری عملی اور ذہنی عدمِ موافقت کا نتیجہ ہے۔ کیا معاشرہ دونوں کو برابر معاشی مواقع دینے کا وعدہ کر سکتا ہے۔ کیا دونوں کو برابر سوشل معیار پر رہنے کی ضمانت دے سکتا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آج تک ہوا ہے۔ اس لیے کہ جو جدید علوم کی ٹوپی پہن کر آتا ہے اس کو سارے مدرسے کی تعلیم والے بونے اور پستہ ذہن نظر آتے ہیں۔ وہ ان کو اپنے معیار اور اپنی سوچ کے گرد گھمانا چاہتا ہے وہ ان کو دین میں حالاتِ جدید کی روشنی میں معمولی سی تبدیلی اور تغیر کی طرف لانا چاہتا ہے، وہ ان کو ان خطوط پر لانا چاہتا ہے جہاں نفس کے خطوط پر زد نہ پڑے اور اسلام بھی اپنی جگہ قائم رہے۔ وہ ان کو اس وسعت کی طرف لانا چاہتا ہے جہاں اسلامی تعلیم کے نقوش نظر آتے رہیں مگر دھندلے دھندلے۔ یہ عصری علوم کا شیدائی بصری علوم والوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے مگر امام بن کر، مقتدی بن کر نہیں، میں قرآن اور حدیثِ نبوی کا حوالہ عمداً نہیں دینا چاہتا ورنہ یہ بات بحث اور جائز و ناجائز کی مد میں چلی جائے گی۔ جو مواد ہم کو پڑھے لکھے انسان کی شکل میں عصری علوم کے اداروں سے حاصل ہو رہا ہے، ان کا معاشرے پر کیا اثر مرتب ہو رہا ہے اور کیا کچھ آج تک ہوا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے اس کا بھی گہرا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

مریدانِ عصری علوم نے ملک و ملت، اسلام و دین، انسان اور معاشرے کو کیا دیا اور اس کی کیا قیمت وصول کی، کون

کون سی خیر اور خوبی سے نکلی اور کس کس بہتری کو فروغ حاصل ہوا۔ کتنوں کو ایمان، صدق، آخرت، موت، قیامت کا ادراک حاصل ہوا اور انسانی بستیوں اور معاشرے کو ان سے کیا فیض حاصل ہوا۔ جو عصری علوم کے جدید لباس میں ملبوس تھے ان کی اپنی زندگی کتنی قابلِ رشک، قابلِ نمونہ اور قابلِ تقلید بنی۔ اگر عصری علوم اتنے ہی نافع، ارفع اور فوز العظیم کے حامل ہیں تو ہم کو دکھایا جائے کہ اس ارضِ الٰہی پر اس کے کیا فوائد اور مثبت نتائج مرتب ہوئے۔

دینی علوم کی منطق اور معاشرتی حیثیت دنیاوی علوم سے جدا ہے۔ دونوں علوم کی کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ایک ہامانی اور قارونی مزاج والا ہے اور دوسرا موسوی اور ہارونی مزاج والا ہے۔ ایک علم سامری کوششوں کا ثمرہ ہے، سونے کے عوض پہلے گدھا بنایا اور پھر گدھے کے عوض میں موسیٰ کو خیر باد کہہ دیا۔ یہ بھی علم ہی تھا اور اس کی مذمت میں نہیں کر رہا بلکہ رب علیم حکیم نے اس کی یہی تعریف کی ہے۔ اور ایک علم آذری ہے جس کو ابراہیم نے کہا کہ اے بابا میری اتباع کریں اصلی اور حقیقی علم لے کر آیا ہوں، میرے علم سے نار نور بن جاتی ہے اور تیرے علم سے نور نار نظر آتا ہے۔ سارے علوم کا نقشہ کتاب مبین میں دیا ہوا ہے اول سے آخر تک پڑھتے جایئے ہر ہر علم نے کیا کیا بانگ دی اور اس کے کرتوت سامنے آتے چلے جائیں گے۔

ایک علم کی کوکھ سے عناد اور فساد کے علاوہ آج تک کچھ اور پیدا ہی نہیں ہوا اور دوسرے کے بطن سے انابت الی اللہ اور اجابت من اللہ کے چشمے ابل رہے ہیں۔ ایک علم ثمودی اور یہودی نعروں کا ترجمان ہے اور دوسرا علم داؤدی اور یعقوبی صفات سے رطب اللسان ہے۔ ایک علم والوں کا نعرہ تھا کہ ہم سے بڑھ کر کوئی قوت والا، مال والا، اولاد والا، کثرت والا اہلِ زمین ہے اور دوسرا علم والا یہ کہتے ہوئے سنا گیا لوگو مجھے سب کچھ کی حکومت عطا ہوئی ہے مگر یہ محض میرے رب کا فضل مبین ہے۔

قلبی علوم و لے لدنی علوم والوں کا تعاقب نہ کریں بلکہ اتباع کریں، ان کی تنقیص، تنقید اور تحقیر نہ کریں بلکہ ان کی تصدیق، تعریف اور تطبیق کریں۔ جو علم مشکاۃ نبوت سے نور لے کر آیا ہو اس کو کس چراغ کی روشنی کی ضرورت ہے۔ جو پانی کی طرح فی نفسہ طاہر ہو اس کو کس پانی سے دھو کر تطہیر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا آفتاب کو دیکھنے کے لیے آفتاب کی ضرورت ہے۔ دینی علوم پر عصری علوم کی دباغت ہو ہی نہیں سکتی۔ اکبر نے یہ جرأت کی تھی مگر مجدد الف ثانی کا رنگ غالب ہو کر رہا۔ حجاج اور یزید نے یہ جرأت کی تھی مگر رنگ حسینی ہی غالب رہا، ہلاکو اور چنگیز نے بھی لاکھوں کو تہ تیغ کر کے غلبے کی کوشش کی تھی مگر خود ہی اس کے رنگ میں رنگے گئے۔ رنگ تو صرف اللہ ہی کا پکا ہے، غالب ہے، موسمی حالات سے کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔

تیسری بات: جو بصری اور نبوی علوم کے حامل ہیں ان سے عالمِ انسانیت کو کیا ملا اس کا بھی تفصیلی تجزیہ ضروری ہے۔ دونوں کے دعویٰ کو حالات اور واقعات کی عدالت میں لا کر ان سے شہادت مانگی جائے۔ کس علم کو قلوب و افکار پر ابدی دوام حاصل ہوا اور کس کی ضرورت دن بدن افزوں ہوتی چلی گئی۔ کس علم کا طالب علم ماں باپ کی خدمت کرتے ہوئے پایا گیا اور کس تعلیم کا حامی والدین کو ایدھی مرکز میں داخل کر کے فرار ہو گیا۔ کس تعلیم نے اپنے سیکھنے والے کو نا سانی رشتوں

کی قرابت، صلۂ رحمی اور انسیت سے مشرف کیا اور کس تعلیم نے بھائی کو بھائی کا گلا کاٹنا سکھایا اور ماں کو مارنا سکھایا اور باپ کو دھکے دے کر گھر سے بھگا دینا سکھایا۔ جو مفتی جو عالم ۲۰ سال تک قرآن کی آیاتِ احسان بالوالدین کو صبح وشام سنتا اور سناتا رہے گا، پڑھتا اور پڑھتا رہے گا وہ کیسے اپنے والدین کو بڑھاپے کی آندھی میں ایدھی سینٹر کی گلی میں چھوڑ آئے گا۔ جو دینی علوم کے وارث ہیں وہ ایدھی بن کر دوسروں کے ماں باپ کی خدمت کر کے جنت کمانے والے ہیں۔

چوتھی بات: کس علم سے جہالت، رشوت، ڈاکہ، شراب، فلمیت، عریانیت، غبن، قتل، زنا، چوری اور دیگر مکروہ جرائم کرنے والے پیدا ہوئے اور کس علم سے ان ساری غلاظتوں کو انسانوں سے دور کرنے اور ان کو پاک اور صاف کرنے والے پیدا ہوئے۔ کس علم سے شرابی حاکم اٹھے اور کس علم سے زانی جرنیل مسلط ہوئے۔ کس علم سے تحریکِ پاکستان کے لیے راتوں کو خانقاہوں اور مصلوں پر رو رو کر دعا مانگنے والے اشرف علی تھانوی، احمد رضا بریلوی، علامہ اقبال جیسے خدادیدہ انسان سامنے آئے اور کس علم سے سکولی اور کاکولی اور ملک کو دولخت کرنے والے جرنیل اور حاکم پیدا ہوئے۔

کس علم کے عالموں نے کس علمی مہارت اور علمی جادوگری سے بینک لوٹے، کیا کسی دارالعلوم کے مفتی نے ڈاکہ مارا، کیا کوئی مفتی کبھی رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا، کیا کوئی عالم، قاری، حافظ، مفتی گینگ ریپ اور گینگ رشوت اور گینگ ڈاکہ مارتے ہوئے دھرا گیا، کیا کوئی مدرسے کا طالب علم کسی ہیروئن اور ایکٹرس سے رات مناتے ہوئے پایا گیا۔

کیا مدرسے کا مفتی کسی کلب میں بے ہوش و بے عقل گرفتار کیا گیا۔ یہ سب کیا ہے؟ افلا تعقلون ؟ افلا تبصرون ؟ افلا یتدبرون ؟ افلا تذکرون ؟ میں دنیاوی تعلیم کا علم بردار ہوتے ہوئے کہوں گا ﴿ مالکم کیف تحکمون ﴾۔ دکھ سے کہوں گا کیا دارالعلوم کا مفتی بھی کسی فلم ہال کی تعمیر اور کسی کلب کے افتتاح کرتے ہوئے پایا گیا۔ کیا جامعہ اشرفیہ کے بانی پر کسی عدالت میں ہیروئن بیچنے کا مقدمہ چلایا گیا، کیا جامعہ نعیمیہ کے مفتی کو کسی رشوت کے کیس میں ملک بدر کیا گیا، کیا اکوڑہ خٹک کے مدرسے کے بانی اور منتظم کو قتل اور ڈکیتی، جوا، شراب کی خرید و فروخت میں ملوث پایا گیا۔ کیا کسی دارالعلوم کے مہتمم پر انگلینڈ کی عدالتوں میں مقدمہ داغا گیا۔ یہ سارے کام تو ان آتشی علوم کے عاشقوں کے ہیں۔ جرائم کی شمع پر کون سے پروانے آ آ گرتے ہیں۔ ذرا اللہ کے لیے غور تو کریں۔ اس شاہراہِ جرم و سزا میں کس کس کے قدموں کے نشاں پائے جاتے ہیں؟ جو رشوت لینے سے منع کرتے ہیں وہ اصلاح کے قابل، عقل سے عاری، ماحول سے جاہل اور تعلیم دیئے جانے کے قابل ہیں یا جو حرام اور حلال کی حدوں سے بالا ہو کر اڑ رہے ہیں وہ قابلِ تعزیر اور قابلِ علاج ہیں؟ جس کو جو مرض لگا ہوا ہے اس کا علاج کیا جانے چاہیے یا کہ تندرست آدمی کو بیماری کی دوا دینی شروع کر دی جائے۔

پانچویں بات: ہر فیکٹری کا ایک اپنا پراڈکٹ اور اس کی مصنوعات ہوتی ہیں۔ اس کے پیچھے اس کے بنانے والے اور چلانے والے اور اس بنے ہوئے مال کو تقسیم کرنے والے ہوتے ہیں۔ مال جتنا مقبول، اچھا، نفع بخش اور دیرپا ہوتا ہے اتنا ہی اس کی نقالی بھی عام ہو جاتی ہے۔ اس مال کی مانگ کو دیکھ کر کچھ جعل سازوں نے اپنی دکان پر اس مال کی نقل اتار لی ہے وہ نقلی مال جو کم قیمت پر بیچا جا رہا ہے اس نے اس اصلی مال کو بدنام کیا ہوا ہے۔ مدارس کی فیکٹریوں سے جو مال بن کر نکل رہا ہے اس کی کھپت اور مانگ آج کی نہیں ہے بلکہ قرنہا قرن سے اس کی ضرورت، طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔

دنیاوی علوم والے کہتے ہیں کہ یہ غیر سودمند یعنی Non Productive فوج ہے، اس سے کیا ملتا ہے، اسلام کو ہر آدمی از خود سے سمجھ سکتا ہے اللہ نے دین کو مولوی کا محتاج نہیں بنایا۔ ہر مسلمان ترجمہ پڑھ کر بآسانی قرآن کو سمجھ سکتا ہے۔ مولوی کی درمیان میں وساطت کہاں سے آ گئی۔ میں معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میرے کالج اور یونی ورسٹیوں کے فارغ العقل اور تہی الفہم دوست برملا یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ مولویوں کا طبقہ ہمارے Issues کو نہیں سمجھتا لہٰذا اس کو کمپیوٹر پڑھاؤ، اس کو عصری علوم پڑھاؤ اس کو پتہ چلے کہ انٹرنیٹ پر کیا گند اور کچرا نشر ہو رہا ہے۔ اس کو ٹی وی دکھاؤ تا کہ اس کو دنیا کی ہر چھپی اور ہر ڈھکی ہوئی غلاظت اور ذلت کا علم حاصل ہو۔ میں اس بات کی صداقت سے متفق ہوں کہ دینی تعلیم اور اس کے نصاب کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے مگر اس کی ترتیب اور ترکیب اس کی ہیئت اور کیفیت پر عصری علوم کا غلاف چڑھانا قطعی غلط بات ہے۔ مسجد کی از سرِ نو تعمیر سے کوئی انکار نہیں، پہلی کو گراؤ اس کو منہدم کر دو مگر اس کی جگہ گرجا نہیں بنایا جاسکتا اس کی جگہ وہی منبر و محراب ہی بنایا جائے گا، ہاں اس نئے منبر و محراب کو شوق سے سجاؤ، تزئین و آرائش کرو، سو رنگوں سے رنگ دو، اس میں تیل کے چراغوں کے بجائے جدید روشنیاں لگاؤ، مگر اس میں اذان اسی مدینے والی بلالی طرز پر دی جائے گی۔ اس مسجد کا قبلہ واشنگٹن نہیں مکہ ہی رہے گا، اس کے منبر سے قولِ جارج بش نہیں قولِ ابراہیم ہی نشر کیا جائے گا۔ اس کی اذان میں ناقوس نہیں لاہوت ہی کی آواز گونجے گی۔ یہ بات قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر مدارس کی تعلیم باقی نہ رہی تو مسجدوں کا وجود بھی رخصت ہو جائے گا۔ اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پہلے تعلیم اتری اس کی ترکیب اور تلاوت پہلے اتری اس کی دعوت اور تبلیغ پہلے اتری، مسجد بعد میں بنائی گئی۔

چھٹی بات: عصری علوم والے اپنی عینک ان کی آنکھوں پر لگانا چاہتے ہیں مگر ان کی عینک کو خود ہرگز استعمال تو درکنار ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتے۔ ہمارے معاشرے کے علمی، فکری، ذہنی اور عملی تضاد، تناقض اور فساد کا یہ اصل روگ اور دکھ ہے۔ ایک طبقہ اپنی فیکٹری کی مصنوعات کو اکیلا مناپلی کے ساتھ بیچنا چاہتا ہے اور دوسرے طبقے کی فیکٹری کو سرے سے آگ لگانے پر تلا ہوا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ فاعتبروا یا أولی الأبصار۔

بالفرض بصری علوم والوں کو سائنس اور کمپیوٹر پڑھا بھی لیا اور ان کو آگاہی ہو بھی گئی تو اس سے کیا وہ نتائج اور فوائد نکل سکتے ہیں جو عصری علوم والوں کو حاصل ہیں۔ کیا یہ اس فیلڈ میں اتنی مہارت، سبقت، فوقیت اور دسترس حاصل کر سکتے ہیں جو مارکیٹ میں ان شعبوں کو درکار ہے۔ ایسی حالت میں وہی ہوگا جو اس ساری غوغائی کا اصل اور خفی مقصد ہے۔ یعنی ان کو ان علوم کی مہارت اور مصروفیت سے اُن علوم کی مشقت میں ڈال دو تا کہ ان کا رخ قدرے کجی کی طرف اور ان کا قدم متزلزل اور ان کا قلب متوہم ہو جائے۔

یہ ناممکن ہے کہ مدرسے والوں کو جدید علوم کی اتنی ہی چاشنی اور چکا چوند نظر آنے لگے جتنی ان کے سامنے والوں کو ہے۔ بلکہ وہ اپنے اصلی اور وہبی علوم کی لذت سے بھی بوجہ اشتراک انصاف نہیں کر پائیں گے۔

ساتویں بات: آج تک تمام تر زورآزمائی اس بات پر کی گئی کہ مدارس کو جدید بناؤ، مدارس کو عصری بناؤ، جدید علوم کو متعارف کراؤ وغیرہ۔ مدرسی علوم کو اس قدر نامکمل اور ناتمام سمجھ لیا گیا ہے گویا اسلام کی تکمیل ہی نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ ان علوم

کو پڑھ نہ لیا جائے۔ مدرسی علوم کی افادیت، حقیقت اور منفعیت کو سمجھے اور جانے بغیر ان علوم کو حالاتِ حاضرہ کے مقابل میں شاید اتنا ناکافی اور نااہل سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کو بھی دوسرے علوم کی طرح بیساکھیوں کی ضرورت ہے۔ جیسے فزکس کے لیے حساب کا علم ضروری ہے ورنہ فزکس کے کلیے حل نہیں کیے جاسکتے۔ یہ بھی ایک مغالطہ شدیدہ ہے کہ علومِ وحی کو علومِ انسانی اور کسبی علوم کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔ حالانکہ انسانی تاریخ کے روزِ اول کے واقعہ سے لے کر آج تک معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور اصلاح، تزکیہ اور تربیت کے علوم کو آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی ان کو ودیعت کیے گئے، تخلیق کے بعد پہلی بات جو سکھائی گئی وہ علم الاسماء والاشیاء تھا، اس کے فوراً بعد علمِ اوامر عطا کیا گیا کہ ان چیزوں کے قریب جانا ہے اور ان کے قریب تک نہیں پھٹکنا۔ اس کے بعد سجدہ اور ذکر کی تعلیم دی گئی۔ یہ ایک مشہور قرآنی واقعہ تخلیقِ آدم کی طرف اشارہ ہے۔ انسان کی تخلیق کے فوراً ساتھ ہی پہلی چیز اس کی اخلاقی ضرورت کا سامان کیا گیا۔ اس کے بعد اس کو بنا بنایا لباس دیا گیا، ستر پوشی کی فطری اور جبلی تعلیم دی گئی، اس کے بعد زمین پر اتارا گیا۔ سارے انبیا کا سلسلہ وار آنا اور آ کر اسی جنتی تعلیم کی تکمیل اور تذکرہ کو زندہ اور تازہ کرنا تھا۔ تعلیمِ صحت اور فنِ سپاہ گری، تعلیمِ ملبوس اور صنعتِ تعمیر بہت بعد میں اور دیر سے عطا ہوا مگر یہ علوم بھی علمِ الٰہی سے انسان کو وحی کیے گئے یہ کسی مدرسے اور کتاب پڑھ کر انسان نے حاصل نہیں کیے۔ مقصد اس عرضداشت کا یہ ہے کہ دینی مدارس پر یک طرفہ جدید علوم کی تحصیل کا دباؤ انصاف اور عقل کے تقاضوں کے منافی اور دین کی روح کے منافی ہے۔

اللہ نے ہدایتِ انسانی کے اہم ہونے کی وجہ سے انبیاء کے سلسلے کو تخلیقِ آدم ہی سے شروع کیا اور حضور پر ختم فرما دیا اور اس کے مقابلے میں ایجادات اور انکشافات کا سلسلہ بہت بعد میں جاری فرمایا اور اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ جو چیز اہم، اشد، اعجل اور مقدم تھی اس کی ترسیل کا سلسلہ پہلے شروع ہوا اور سائنسی ایجادات اور معلومات انسان کے لیے جب اہم اور ضروری ہوتی چلی گئیں تو ان کا انسان پر ادراک وقت کے ساتھ ہوتا چلا جائے گا۔ یہ آتشی علم اہم اور مرکزی یا بنیادی اور کلیدی حیثیت کا حامل نہیں تھا اسی لیے اس کی حفاظت اور اس کا نزول انبیاء کے علاوہ بھی عام لوگوں پر کیا گیا۔ آتشی علم یا بدنی علم یا عام طور پر مادی علم کا فہم، ادراک، تعقل اتنی حفاظت، اہمیت کا متقاضی نہیں تھا جتنا ہدایت، اصلاح، تزکیہ اور تربیت کا علم تھا۔ اس لیے انبیاء کا سلسلہ پہلے شروع ہوا اور پہلے ختم ہو گیا اور یہ صنعتی علوم، انکشافی اور ایجادی علوم ابھی مزید کئی جارج بشوں اور نیوٹنوں پر کھلتے چلے جائیں گے۔ یہ بطنی علوم ہیں اور اہلِ بطن نے ان پر خوب محنت کی اور اس سے نفع بھی اٹھایا۔ اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو بطنی اور ارضی علوم (میں اس کو دنیا کی نسبت سے عارضی علوم کہتا ہوں) پر جان کھپائے گا وہ یقیناً اس کے نفع بھی پائے گا۔ باطنی علوم انبیاء کی وساطت سے انسانوں کو عطا ہوئے اور ان کی ترویج، اشاعت، تبلیغ پر اللہ کے منتخب شدہ انسانوں کو مامور کیا گیا۔

آٹھویں بات: دینی ادارے اس بات کے کبھی بھی متقاضی نہیں ہوئے کہ ان آتشی علوم (میں ان کو آتشی علوم اس لیے کہتا ہوں کہ ساری دھاتیں بھٹی میں پگھلا کر اور طویل کیمیائی عمل سے گزر کر خالص دھات اور اصلی شکل میں آتی ہیں) اور آبی علوم (جن کا تعلق صنعتِ آب سے ہے جیسے بحری جہاز، آبدوز، کشتی، زیرِ آب تحقیقاتی مشینیں وغیرہ)، ہوائی علوم،

ترابی علوم اور دیگر سارے دنیاوی علوم سیکھنے والوں پر دینی علوم کی پابندی لگائی جائے۔ میں اس بات کو اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس شدومد سے آتشی علوم والوں نے اپنی توپوں کا رخ جتنی علوم سیکھنے والوں کی طرف کیا ہوا ہے اور صدرِ مملکت سے لے کر ایک عام آدمی تک اس بات پر زور لگا رہا ہے کہ ان کا نصاب بدل دو، ان کا نصاب اپٹوڈیٹ کر دو، ان کو جدید روشنی سے قریب لاؤ، اسی شدومد سے دینی مدارس بھی اس بات کے متقاضی ہیں کہ تمام کالجوں میں اور اداروں میں دینی تعلیم کا سارا سلیبس شامل کیا جائے تاکہ ان کو بھی معلوم ہو کہ یہ صرف ونحو، منطق، تفسیر، حدیث، تطبیق، تقابلِ ادیان، اجتہاد، تفقہ، حفظ، ناظرہ، کلیلہ ودمنہ، قدوری، الکافی، بخاری ومسلم، حرام، حلال، مباح، مکروہ، مستحب، واجب، فرض اور تمام دینی اصطلاحات کا کیا پسِ منظر ہے۔ ان کو بھی وہ سب کچھ پڑھایا جانا چاہیے جو ایک مسلمان کے لیے کم از کم درجے میں فرض کیا گیا ہے۔ جس قدر اہل مدرسہ کو جدید علوم کی ضرورت ہے اتنی ہی اہلِ کالج کو دینی علوم کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ دینی علوم لے کر بازار میں آنے والا انسانوں کے لیے زہریلا اور گرہ کٹ ثابت نہیں ہوتا جب کہ ایک راشی انجینئر، ایک خائن افسر، ایک ظالم جج، ایک غدار فوجی اور ایک شرابی حاکم جس قدر ایذا اور ضرر رسانی کا سبب بنتا ہے۔

دینی علوم کے اندر آتشی علوم کو اگر داخل کر دیا گیا تو اس کا انجام بہت سے خطروں کو جنم دے گا۔ میں ایک انجینئر ہونے کے ناطے آتشی علوم کی افادیت کا یقینی طور پر قائل ہوں مگر اس طور پر کہ موچی کو جوتا گانٹھنے کا علم سکھاؤ اور اس کے متعلقہ چمڑے کے سارے علوم شوق سے سکھاؤ، اس کو پالش کرنا سکھاؤ اس کو اس کے جزئیات کا علم سکھاؤ مگر اس کو سونے اور چاندی کی مینا کاری کا علم سکھانا، سونے کا کیمیائی فارمولا اور اس کا اٹامک ویٹ سکھانا قطعاً کوئی نفع نہیں دے گا۔ علم کسب کے حسب حال اور اس کا امام ہوتا ہے۔ مدارس والوں کے علم کا مقصد انسان کے مطالبہ آخرت سے آگاہی پیدا کرنا ہے، منشاء نبوت اور مرادِ الٰہی کو متعین کرنا ہے۔ ان کو اسی کام کے لیے مختص کر دو اور اگر یہ اس میں خیانت اور تساہل کے مرتکب پائے گئے تو ان کی سزا بھی ہم سے دگنی ہوگی۔

نویں بات: جتنا سرمایہ آتشی اور عصری علوم کی اشاعت پر صرف ہو رہا ہے اس کا ایک لاکھوں حصہ اگر بصری اور دینی علوم پر خرچ کیا جانے لگے تو مدارس کی ناگفتہ بہ حالت اور اساتذہ، علماء کی معاشی حالت بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ اگرچہ علماء اب بھی دست درازی اور الحاقی کیفیت سے گریز کرتے ہیں مگر ان کے انسانی تقاضوں کو پورا کرنا اسلامی معاشرے پر حق ہے۔ تمام اداروں میں اسلامی علوم کی اشاعت کے لیے مستند اور محقق علماء، مفتیان، حفاظ کرام کو معقول معاوضے دے کر ان کو معاشی عزت دی جائے۔

دسویں بات: ہم جو نفر مدارس میں داخل کرتے ہیں وہ بھی ہماری ایمانی کمزوری کی علامت ہے۔ ہم جو داخل کریں گے وہی کچھ تو خارج ہوگا۔ اگر ہم اندھے، معذور، ذہنی طور پر غبی جو اسکول میں نہ چلے سکے، جو ہماری دکان پر بھی نہ بیٹھ سکے ایسے متروک المعاشرہ افراد کو مدارس میں داخل کرا دیں اور یہ اُمید لگالیں کہ غزالی اور ابنِ تیمیہ اور امام رازی کی طرح فلاسفر بن کر نکلیں گے تو یہ خام خیالی ہے۔ اللہ نے صدقہ دینے والی آیات میں ایسے مال کا صدقہ دینے سے کراہت کا اظہار کیا ہے جو ردی اور گھٹیا ہو جس کو تم خود بھی لینا پسند نہ کرو۔ یہ آیت یہاں بھی اسی معنی کا تقاضا کرتی ہے جو اصلی کریم ہو

اس کو ہم ایچیسن کالج، کیڈٹ کالج اور نشتر میں بھیج دیں اور جو چھاچھ اور تلچھٹ ہو اس کو ہم جامع بنوری ٹاؤن کے مدرسے میں جمع کرادیں، فیاللعجب۔

جو چیز دیکھنے میں آرہی ہے کہ ایک کرکٹ کے کھلاڑی کو ایک سٹروک پر دس لاکھ کے انعام سے نواز دیا جاتا ہے اور وہ بچہ جو انجینئر نگ یونی ورسٹی اور میڈیکل یونی ورسٹی کی تعلیم حاصل کرتے کرتے اس کے بال سفید ہو جاتے ہیں تب جا کر قوم کو ڈاکٹر قدیر جیسا قابلِ صد احترام تخلیقی ذہن ملتا ہے اس کو تو وظیفہ بھی اتنا نہیں دیا جاتا جس سے وہ اپنی تعلیم ہی پوری کر سکے۔ یہ دینی علوم کی توہین کے علاوہ سائنسی اور کسبی اور فنی علوم کی بھی ناقدری اور بے وقعتی ہے۔ ہم کھیلوں کے فروغ کے مخالف نہیں ہیں مگر کھیل کود سے کبھی کوئی قوم اس شدید علمی مقابلے کی دوڑ میں فروغ نہیں پاتی۔ بات ترجیح کی ہے کہ کھیل کود سے فارغ ہو کر علوم وفنون سیکھے جائیں گے یا علوم وفنون سے فارغ ہو کر تفریحِ طبع اور انشراحِ طبیعت کے لیے کھیلا جائے گا۔ جتنی رقم اور وسائل کھیل کود پر صرف ہو رہے ہیں اس کا ہزارواں حصہ بھی دینی تعلیم پر لگائے بغیر، ہم دینی مدارس کی حالت درست کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں اور مستعد نظر آتے ہیں۔ جن کو ہم ملک کا سفیر بنا کر لاکھوں روپے صرف کر کے بھیجتے ہیں وہ وہاں کیسی کیسی سفارت کاری کے جوہر درخشاں دکھاتے ہیں۔ خدا کے لیے اخباروں ہی کو پڑھ لیجیے ساری داستانِ الف لیلہ سامنے آجائے گی۔

دینی مدارس کی اصلاح اور نصاب کو ایک مشترک علماء کا بورڈ بنا کر اس کے حوالے کیا جائے اور یہ بورڈ مناسب اور ضروری حد تک عصری علوم کا ایک نصاب تیار کریں۔ ہر بچہ اتنی استعداد کا حامل نہیں ہوتا کہ وہ سارے علوم پر قابو پالے، ان میں سے ذہین اور اچھی استعداد والے بچوں کے وظائف مقرر کیے جائیں اور ان کو جماعت کی شکل میں دنیا کے سارے اسلامی سنٹرز کا دورہ کرایا جائے اور مختلف طبقات سے ملوایا جائے تاکہ ان کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہی ہو۔ ایک ہی ماحول میں اول سے آخر تک رہنے والے بچے ذہنی جمود اور فکری ٹھہراؤ کا شکار ہو جاتے ہیں، لہٰذا پاکستان کے اندر بھی طلبا کو ایک ہی مسلک کے مدارس کا وقتاً فوقتاً دورہ کرواتے رہنا چاہیے۔ دینی مدارس کا اپنے اندر بھی ایک تبادلہ اور مباحثہ کا انتظام ہونا چاہیے تاکہ ان میں برداشت اور تحمل کا جذبہ پیدا ہو۔ اللہ مجھے اور ہر مسلمان کو دینی علوم سے بہرہ ور فرمائے اور علم کا نور عطا فرمائے اور کسی نہ کسی شکل میں دین کی خدمت کا کام لے لے۔ آمین

آپ کا بہت سا وقت لے لیا مگر دینی غیرت کا ایک سیلاب تھا جو اس عنوان کو پڑھتے ہی دل میں موجزن ہو گیا، اس امانت کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ اللہ کو قیامت کے دن شاید اسی مزاحمت اور جذبۂ غیرت پر اس فقیر کے حال پر رحم آجاوے اور عنایت ہو جاوے۔ آمین۔ اپنے الفاظ کو شیرازیؒ کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

شمہ از داستانِ عشق شور انگیزِ ماست
ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

ہمارے شور انگیز عشق کی داستان کا یہ بیان، فرہاد و شیریں کے بیان کردہ قصوں کا ایک شمہ، یعنی ذرہ برابر حصہ ہے۔

☆☆☆